بنی اسرائیل کی تاریخ حیات

اور صہیونی تحریک

سید جمال حسن صاحب شیرازی بی۔اے

دنیا میں قومیں بگڑتی ہیں اور سنورتی بھی، کبھی محکوم ہوتی ہیں اور کبھی حاکم۔ کبھی خود کسی دوسرے ملک کے زیر اقتدار رہتی ہیں اور کبھی دوسری حکومتوں کو اپنا حلقہ بگوش بنا لیتی ہیں۔ کبھی ترقی و فلاح اور تہذیب و تمدن کی بلند ترین چوٹی پر پہنچ جاتی ہیں اور دوسری قوموں پر اپنی برتری اور عظمت کا سکہ بٹھا دیتی ہیں اور کبھی انحطاط اور تنزل کی ایسی پست گہرائیوں میں گر جاتی ہیں کہ دنیا انھیں دیکھکر عبرت اور موعظت حاصل کرتی ہے۔ غرضکہ نظام قدرت میں جس طرح ایک انسان اپنی زندگی میں راحت و رنج، دکھ سکھ، تکلیف و آرام ترقی و تنزل تمام چیزوں سے دوچار ہوتا ہے اسی طرح ایک قوم کو بھی مجموعی حیثیت سے زندگی کی دشوار گذار گھاٹیوں اور سرسبز و شاداب وادیوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اقوام عالم کی تاریخ پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ عروج و زوال کا اصول ہر جگہ اور ہر دور میں کارفرما نظر آئیگا۔ لیکن بنی اسرائیل ہی ایک ایسا گروہ ہے جس کی قومی زندگی کا بیشتر حصہ مصائب و آلام اور درد و کرب میں گذرا ہے۔

بنو اسرائیل سب سے پہلے بابل سے مصر گئے۔ لیکن جب مصر میں بھی فرعون نے ظلم کرنا شروع کیا تو وہاں سے بھی ہجرت کر کے جزیرہ نما سینا پہنچے اور ایک عرصہ دراز تک عرب کے ریگستانوں میں خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے رہے۔ پھر سنہ ۱۲ ق۔م۔ میں شام اور فلسطین میں آباد ہو گئے اور اپنی

حکومت قائم کی۔ لیکن پہلی صدی عیسوی میں دوبارہ پراگندگی اور انتشار پیدا ہوا جو ابتک جاری ہے۔ اس قوم کی مسلسل زبوں حالی اور پراگندگی کے دنیاوی اسباب کچھ بھی بتلائے جائیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ خدائے عزوجل کا عتاب اس قوم پر ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جس فرد یا قوم پر خدائے واحد کا عتاب نازل ہوا سکا ٹھکانا دین و دنیا میں سوائے ذلت اور عذاب جہنم کے اور کہاں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن عزیز میں اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر یوں عتاب فرماتا ہے" وضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ وباؤ بغضب من اللہ" (اور ڈالی گئی ان پر ذلت اور محتاجی اور پھرے وہ اللہ کا غصہ لیکر (سورہ بقرہ آیتہ ۵۸) یعنی بنی اسرائیل پر خواری اور نامرادی کی مار پڑی۔ اور خدا کی پھٹکار کے سزاوار ہوئے۔ اور یہ اسلئے ہوا کہ یہ خدا کی آیتوں سے انکار کرتے تھے۔ اور نبیوں کو ناحق قتل کر دینے میں بیباک تھے۔ اور گمراہی اور شقاوت کی یہ روح ان میں اسلئے پیدا ہوگئی تھی کہ اطاعت کی جگہ سرکشی چھائی ہوئی تھی۔ اور حق و ہدایت کی حدیں توڑ کر بے لگام ہوگئے تھے۔[1]

اس آیۂ قرآنی کے علاوہ چند ایسی احادیث بھی ہیں جن میں بنی اسرائیل پر خدا کے غیظ و غضب کا ذکر ہے اور صرف اسلام کی ہی نظر میں بنی اسرائیل اس عتاب الٰہی کے مستحق نہیں سمجھے جاتے بلکہ عیسائیت میں بھی اس قسم کی متعدد روایتیں پائی جاتی ہیں۔ ان روایتوں میں سے ایک مشہور روایت یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھانے کیلئے لیجایا جارہا تھا تو ایک یہودی نے جسکا نام کارٹافیلز (Cartaphilus) اور جو پائیلیٹ (Pilate) کا دربان تھا حضرت عیسیٰؑ کی گردن پر ایک طمانچہ مارا اور کہا! "چلے یسوع جا! جلدی جا شٹک شٹک کر کیوں چلتا ہے" اس پر حضرت عیسیٰؑ نے جواب دیا" میں تو جارہا ہوں لیکن تو اس دنیا میں اس وقت تک مارا مارا پھرتا رہیگا جبتک کہ میں واپس نہیں آؤں۔ بہت سے عیسائیوں کا خیال ہے کہ یہ بددعا صرف اس یہودی کے حق میں نہیں تھی بلکہ سا

[1] ترجمان القرآن ص۱۹

قوم یہود کیلئے تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ قوم اسوقت سے آجتک پراگندہ اور پریشان حال ہے۔[1]

بنی اسرائیل کے انتشار کا آغاز پہلی صدی عیسوی میں روم سے شہنشاہیت کا ایک سیلاب اٹھا اور بڑی تیزی کے ساتھ تھوڑے ہی عرصہ میں دنیا کے ایک بڑے حصہ پر چھا گیا۔ اس سیلاب کا ایک رخ شام اور فلسطین کی طرف بھی ہوا۔ اور رومی بھیڑیوں کا ایک خونخوار غول بنی اسرائیل پر ایسی درندگی اور خونآشامی کے ساتھ ٹوٹا کہ تمام اسرائیلی گلہ منتشر ہوگیا۔ بیشمار یہودی قتل کردیئے گئے۔ ان کے گھر بار لوٹ لئے گئے ان خانماں بربادوں کی ایک بہت بڑی تعداد فلسطین و شام سے مختلف سمتوں کو چلی گئی۔ لیکن وہ جہاں کہیں بھی گئے انھیں اطمینان اور چین نصیب نہیں ہوا۔ مسیحی اقوام نے تعصب اور دشمنی کا پورا جوش دکھایا اور ہر جگہ ان کو تباہ و برباد کیا۔

ظہور اسلام اور اسرائیلی گلہ اس کے بعد ساتویں صدی عیسوی میں آفتاب اسلام طلوع ہوا اور عرب و عجم، شام و فلسطین، افریقہ اور اسپین میں جب اسلامی حکومت قائم ہوئی تو اسرائیلی گلہ کو رومی بھیڑیوں کی لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت سے نجات ملی اور چند صدیوں کے بعد ایک بار پھر وہ امن و سکون کی فضا میں سانس لینے لگا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلام نے یہودیوں اور نصرانیوں کے ساتھ جو انصاف اور مذہبی رواداری برتی اس کی مثال دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔ اس دور میں یہودیوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ جہانتک شہری اور معاشرتی حقوق کا تعلق تھا وہ مسلمانوں کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ غرض ان کی تہذیب، ان کا تمدن، اور ان کا مذہب ہر طرح سے محفوظ تھا چنانچہ بہت سے یہودی مصنفوں نے اپنی تصانیف میں اس امر کا خاص تذکرہ کیا ہے کہ اگر ساتویں صدی میں اسلام کا ظہور نہ ہوتا تو یہودی مذہب، یہودی تہذیب اور یہودی کلچر دنیا سے یکقلم مٹ گیا ہوتا۔

مغضوبیت کا دوسرا دور پھر چند صدیوں بعد مسلمانوں کے انحطاط کا دور آیا تو یہودیوں پر ایک بار پھر

---

[1] دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹینکا جلد نمبر ۱۳

ظلم اور تشدد کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ یہ دور قوم یہود کی تاریخ حیات کا تاریک ترین دور ہے۔ مشہور ہے کہ قرونِ وسطی (Dark Ages) میں ساری دنیا کے یہودیوں پر جو مظالم کئے گئے اس کی مثال تاریخ عالم میں کہیں نہیں ملتی۔ عیسائیوں نے سارے یورپ میں یہودیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں کی تعداد میں یہودی تہ تیغ کر دیئے گئے۔ ان کی عورتیں اور بچے زندہ آگ میں جلائے گئے۔ ان کے تمام علمی اور مذہبی ادارے بند کر دیئے گئے۔ ایک بہت بڑی تعداد کو جور وستم اور جبر و تشدد کے ذریعے عیسائی بنا لیا گیا۔ غرض اس دور میں یورپ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جہاں کی زمین یہودیوں کے خون سے سرخ نہ ہوئی ہو۔ قرون وسطی کا یورپین لٹریچر ان مظالم کے واقعات وحادثات سے بھرا ہوا ہے۔ ملکہ الیزبتھ (Elizabethan age) کے دور کا ایک مشہور مصنف مارلو (Marlow) اپنی معرکۃ الآرا تصنیف باراباس (Barabas.) میں عیسائیوں کی یہود دشمنی کا ایک بھیانک نقشہ کھینچتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس زمانہ میں یہودیوں کو سوسائٹی میں "پلیگ" سے بھی زیادہ خطرناک اور نفرت انگیز سمجھا جاتا۔ اور روزانہ زندگی میں انھیں ایک کتے سے بھی زیادہ ذلیل وخوار خیال کیا جاتا تھا۔ خود مارلو کے الفاظ میں "یہودی ایک ایسا عفریت صفت انسان تھا جو دائرہ انسانیت سے خارج شمار کیا جاتا تھا۔"

شکسپیر نے بھی اپنے ڈرامہ مرچنٹ آف وینس (Merchant of Venice) میں اس دور کے یہودیوں کی مظلومیت اور مغضوبیت کی تصویر کھینچی ہے۔ اس ڈرامہ کا کردار شائلاک (Shylock) (ایک یہودی سوداگر) عیسائیوں کے ظلم اور نفرت سے عاجز آ کر انتقام پر آمادہ ہوتا ہے اور انٹونیو (Antonio) (ایک عیسائی سوداگر) سے انتقام لینے کے سلسلے میں یوں بول اٹھتا ہے: "اس نے مجھے ذلیل کیا ہے میرے نقصان پر شادیانے بجائے ہیں، میری قوم کا مذاق اڑایا ہے میرے دوستوں کو میرا مخالف بنایا۔ اور میرے دشمنوں کو میرے خلاف ابھارا ہے اور یہ سب کیوں ہوا ہے

صرف اسلئے کہ میں ایک یہودی ہوں . . . کیا ایک یہودی کے آنکھیں نہیں ہوتیں، کان نہیں ہوتے، اسکے ہاتھ پاؤں نہیں ہوتے، احساس نہیں ہوتا، جذبات نہیں ہوتے . . . کیوں! ایک یہودی بھی وہی غذا کھاتا ہے جو ایک عیسائی، وہ بھی انہیں ہتھیاروں سے مجروح ہو سکتا ہے جس سے ایک عیسائی، اور اس کے زخم کا علاج بھی اسی دوا سے کیا جاتا ہے جس سے ایک عیسائی کا، وہ بھی اسی موسم سرما اور گرما میں سانس لیتا ہے جس میں ایک عیسائی . . . . پھر اگر تم ہمیں سوئی چبھوتے ہو تو کیا ہمارے جسم سے خون نہیں نکلتا۔ اگر تم ہمیں گدگداتے ہو تو کیا ہمیں ہنسی نہیں آتی، اور اگر تم ہمیں زہر کھلا دیتے ہو تو کیا ہم ہلاک نہیں ہو جاتے۔ پھر اگر تم ہم پر ظلم کروگے تو کیا ہم اس کا انتقام نہ لیں گے۔ یہ شائلاک کی آواز نہیں ہے بلکہ قرون وسطیٰ کے تمام یہودیوں کے دکھوں کی پکار ہے اور انسانیت کے سامنے ایک اپیل ہے۔

دورِ مادیت کا اثر یہودیت پر | اس کے بعد یورپ میں نئی تہذیب کا آفتاب طلوع ہوا۔ سائنس کی نت نئی ایجادات نے فکر و نظر، مذہب اور روح کی دنیا میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا۔ اوہام پرستی اور مذہبی تنگ نظری کا دور تو ختم ہوا لیکن خدا پرستی اور روحانیت سے بُعد پیدا ہو گیا۔ خیالات و افکار میں وسعت اور تبدیلی پیدا ہوئی۔ اور یوروپی دنیا کے ہر گوشہ سے مادی ترقی کی صدا بلند ہونے لگی۔ مادیت (Materialism.) کا یہ سیلاب ایسا ہمہ گیر اور انقلاب انگیز تھا کہ پہلے زمانے کے تمام افکار و نظریات پر چھا گیا۔ اب اگر یورپی اقوام کو لگن تھی تو صرف ایک بات کی اور وہ یہ کہ مادی ترقی میں ایک دوسرے پر بازی لے جائیں۔ مادیت پرستی نے سرمایہ پرستی کا بیج بویا اور سرمایہ پرستی نے ایک ملک کا دوسرے ملک پر اقتصادی اقتدار جمایا۔ غرضکہ اس اقتصادی اقتدار (Economic Control) کو حاصل کرنے کیلئے مختلف ممالک میں باہمی رسہ کشی شروع ہو گئی۔ اور اس رسہ کشی کی جنگ میں فتح حاصل کرنے کیلئے ہر ملک میں جذبہ قومیت (.Nationalism) پیدا ہوا۔ اور حکومت نے

اس جذبہ کو زیادہ سے زیادہ ابھارا۔ جذبۂ قومیت کی اس طوفانی تحریک کا اثر جس طرح تمام یورپی اقوام پر پڑا اسی طرح یہودیوں پر بھی اس کا بہت گہرا اثر ہوا۔ اور ان کا یہ جذبہ جو اب تقریباً مردہ ہو چکا تھا، دوبارہ زندہ ہو گیا۔ لیکن یہ وہ دور تھا جب یوروپ کے یہودی اپنے سیاسی اور شہری حقوق کیلئے سخت جدوجہد کر رہے تھے۔ ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جب تک یہودی اپنی مذہبی، قومی اور نسلی خصوصیت وامتیاز سے دستبردار نہیں ہوں گے اسوقت تک یہ عیسائیوں کے جور وستم کے شکار بنے رہیں گے۔ اس لئے انھوں نے اس تحریک قومیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بات کی کوشش کی کہ یوروپی اقوام میں گھل مل جائیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے لباس اور دیگر معاشرتی خصوصیات میں تبدیلیاں کیں۔ مذہبی معاملات میں بھی موقع اور مصلحت کے لحاظ سے الٹ پھیر کرنے لگے۔ اور یہودیت کے مخصوص اور محدود پہلوؤں کو پس پشت ڈالکر اس کے ہمہ گیر پہلوؤں کو روشنی میں لانیکی زیادہ کوشش کی۔ یہانتک کہ آداب عبادت میں بھی چند تبدیلیاں کر بیٹھے۔ اور بعض مقدس کتابوں سے صیہون اور یروشلم وغیرہ کے نام تک خارج کر دیئے گئے۔ عبرانی زبان کو ترک کر دیا گیا۔ اور یوروپ کی مختلف زبانوں میں یہودیوں کے مذہبی لٹریچر کا ذخیرہ منتقل ہو گیا۔[1]

اگر یہ تحریک کامیاب ہو جاتی تو قوم یہود ہمیشہ کیلئے امن وسکون کی زندگی بسر کرتی۔ لیکن یہ تحریک کامیاب نہ ہو سکی اور ہوتی بھی کس طرح جب کہ اس کا مقصد آیت قرآنی سے ٹکراتا تھا۔ کیا قرآن عزیز کی تکذیب کبھی ممکن ہے؟

ہوا کا رخ پلٹ گیا جدید تصورات ونظریات کے اس طوفانی دور میں یہودیوں میں ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی جس نے دوبارہ اپنی قوم کے نسلی اور مذہبی جذبات واحساسات کو ابھارنا شروع کیا۔ اس نے پہلی تحریک کا یکسر رخ پھیر دیا۔ اس تحریک کے ذریعے فلسطین اور یروشلم سے یہودیوں کی قدیم

[1] دیکھو انسائیکلوپیڈیا آف اتھکس اینڈ ایلیجنس جلد ۱۲

محبت اور روحانی وابستگی کو زندہ کیا جانے لگا۔ ۱۸۶۲ء میں موزز ہس (Moses Hess) نے ایک کتاب "روم اینڈ یروشلم" (Rom and Jerusalem) کے نام سے لکھی اور جرمنی میں شائع کرائی۔ اس کتاب میں دنیا کے سامنے یہودی قوم کو ایک واحد قوم کی حیثیت سے پیش کرنے کے بعد اس امر پر زور دیا گیا تھا کہ انھیں فلسطین میں واپس آنے اور ایک یہودی اسٹیٹ قائم کرنے کی اجازت دیدی جائے۔ لیکن اس تحریک میں عام یہودیوں سے قطع نظر خود جرمنی کے یہودیوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اور لیتے بھی کس طرح۔ جب کہ وہ جانتے تھے کہ صرف قدیم روحانی وابستگی کی بنا پر یروشلم اور فلسطین میں ایک یہودی اسٹیٹ قائم کرنے کا مطالبہ بالکل لغو اور بے معنی تھا۔ اس کی مثال تو ایسی ہے کہ ہندوستان کی ڈراوڈین قوم آج پہاڑوں اور جنگلوں سے نکل آئے اور انگریزوں سے یہ مطالبہ کرے کہ چونکہ یہ ہمارا پرانا دیش ہے اور ہمارے باپ داداؤں نے اس پر حکومت کی ہے اسلئے ہم یہاں دوبارہ اپنی حکومت قائم کریں گے۔ تم لوگ بدیشی ہو یہاں سے نکل جاؤ۔ یا انگلینڈ کے اصلی باشندے آج اینگلو سیکشن نسل (Anglo Saxonrace) سے اسی بنا پر انگلینڈ کی حکومت سے دست بردار ہو جانے کا مطالبہ کریں۔ بہرحال اگرچہ اس وقت یہودیوں نے اس تحریک پر لبیک نہیں کہا لیکن درحقیقت صیہونی تحریک کی ابتدا یہی تھی۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس تحریک کے حقیقی باعث یوروپ کے عیسائی ہی تھے جنھوں نے یہودیوں کو سیاسی اور معاشرتی حقوق سے محروم کرکے اور ان پر پے در پے مظالم ڈھاکر ان میں کنارہ کشی اختیار کرنے اور ایک علیحدہ اسٹیٹ قائم کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔

اس کے بعد ۱۸۸۱ء میں لیو پنسکر (Leo Pinsker) نے سارے دنیا کے یہودیوں کو منظم اور متحد کرنے کی تحریک شروع کی۔ اس سلسلے میں اس نے ایک کتاب بھی لکھی اور اس امر پر زور دیا کہ بنی اسرائیل کے گلہ میں چونکہ اتحاد اور تنظیم نہیں ہے اور وہ دنیا کے مختلف حصوں میں پراگندگی اور

انتشار کی زندگی بسر کر رہے ہیں اسی لئے ذلیل و خوار ہیں۔ انھیں چاہیئے کہ کسی ایک ملک میں جمع ہو جائیں اور منظم اور متحد ہو کر اپنی فلاح و بہبود کے لئے کوئی راہ عمل تلاش کریں۔ اس تحریک کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں فلسطین میں واپس آنے اور اسٹیٹ قائم کرنے کی قید نہیں تھی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ دنیا کے کسی گوشے میں ایک قومی تنظیم کے ماتحت زندگی بسر کریں۔ اس تحریک کا عام طور پر یہودیوں نے خیر مقدم کیا اور اس کے عملی پہلوؤں سے بھی دلچسپی لینے لگے۔ لیکن آگے چل کر یہ تحریک بھی ناقابل عمل ثابت ہوئی اور ایک عرصہ کے لئے خاموش ہو گئی۔

جدید صیہونی تحریک کا احیاء ۱۸۹۶ء میں وائنا کے ایک یہودی تھیوڈ ہرزل نے دوبارہ اس تحریک میں روح پھونکی۔ دراصل صیہونی تحریک کی موجودہ شکل اسی شخص کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس نے جوڈن اسٹاٹ (Judenstaat) کے نام سے ایک کتاب لکھی اور یہ تحریک کی کہ دنیا کے تمام یہودیوں کو بے رحم ممالک سے نکل کر ایک مرکز پر جمع ہونا چاہیئے اور ایک دولت مشترکہ (Common wealth) قائم کرنے کی اسکیم مرتب کرنی چاہیئے۔ تھیوڈ ہرزل ایک اعلیٰ شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے بہت جلد اپنی قوم کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔ بالآخر ساری دنیا کے یہودیوں نے ملکر ۲۹ اگست ۱۸۹۷ء میں بیسل (Basel) کے مقام پر ایک کانفرنس منعقد کی۔ اور اسی کانفرنس میں صیہونی انجمن کی بنیاد ڈالی گئی۔ صیہون اس پہاڑ کا نام ہے جس پر بیت المقدس واقع ہے۔ صیہونی تحریک کے اغراض و مقاصد مرتب کئے گئے اور ایک مفصل پروگرام تیار کیا گیا۔ اس کا مقصد قوم یہود کیلئے فلسطین میں ایک تسلیم شدہ اور قانونی نقطۂ نگاہ سے مکمل اسٹیٹ قائم کرنا قرار پایا۔ کانفرنس نے حسب ذیل قرارداد پاس کی۔

(۱) ایک یہودی اسٹیٹ قائم کرنے کی غرض سے تمام دنیا کے زراعت پیشہ، تجارت پیشہ اور صنعت پیشہ یہودیوں کو فلسطین میں لا کر بسانا۔

(۲) تمام دنیا کے یہودیوں کو منظم کرنا اور اس مقصد کے لئے مقامی اور مرکزی جماعتوں کی تشکیل کرنا۔

(۳) یہودیوں کے جذبۂ قومیت کو بیدار کرنا اور ان میں خود شعوری پیدا کرنا۔

(۴) اس تجویز کو دنیا کی اہم حکومتوں کے سامنے پیش کرنا اور ان کی منظوری حاصل کرنا۔[۱]

اس تجویز کی منظوری حاصل کرنے کیلئے سب سے پہلے تھیوڈر ہرزل نے سلطان عبدالحمید سے ۱۹۰۱ء میں کئی بار ملاقات کی لیکن سلطان نے اسے ماننے سے انکار کردیا۔ اس کے بعد تھیوڈر نے دوسری حکومتوں کی طرف بھی رجوع کیا لیکن ہر جگہ اسے مایوسی ہوئی۔ بالآخر ہر طرف سے مایوس ہوکر اس نے اینگلو مصری حکومت سے درخواست کی کہ جزیرہ نمائے سینا (Sinai Peninoula) کا علاقہ یہودیوں کی نوآبادی کیلئے حکومت کی طرف سے انھیں دیدیا جائے۔ حکومت برطانیہ نے اسے منظور کرلیا۔ لیکن چونکہ یہ علاقہ زرخیز نہیں تھا اس لئے اس میں آبادی نہیں بسائی جاسکی۔ اس کے بعد مسٹر جوزف چیمبرلین نے مشرقی افریقہ کے ابتدائی علاقہ میں غوث غنیشو (Gaus Gnishu) کا خطہ یہودی نوآبادی کیلئے پیش کیا۔ صیہونی انجمن نے ایک کمیشن مقرر کیا کہ اس خطہ کا دورہ کرکے اس کی ایک رپورٹ تیار کی جائے۔ بالآخر کمیشن کی رپورٹ شائع ہونے پر یہ پیشکش بھی مسترد کردی گئی اس کے بعد یہودیوں نے اس تحریک سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور ایک دوسری انجمن کی بنیاد ڈالی اس انجمن کا مقصد دنیا کے مختلف گوشوں میں یہودیوں کے لئے چھوٹے چھوٹے علاقے خرید کر خودمختار اسٹیٹ قائم کرنا قرار پایا۔ انجمن نے حصول مقصد کیلئے سارنیکا (Cyrenica) کینیڈا، آسٹریلیا اور میسوپوٹامیا (Mesopotamia) وغیرہ کا دورہ کیا لیکن کوئی مناسب اور معقول علاقہ دستیاب نہ ہوسکا۔

---

[۱] تفصیل کیلئے دیکھو انسائیکلوپیڈیا آف اتھکس اینڈ ریلیجنس جلد ۱۲۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ آج یہودی فلسطین میں اسٹیٹ قائم کرنے کی جدوجہد میں اس ملک سے اپنی مذہبی وابستگی اور روحانی لگاؤ پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں حالانکہ اوپر کی سطور سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اگر دنیا کے کسی دوسرے علاقہ میں کوئی زرخیز خطہ انھیں ملجاتا تو وہ یروشلم اور فلسطین کے دعوی سے دستبردار ہو جاتے۔ ۱۹۰۵ء میں تھیوڈ ہرزل مرگیا اور پھر یہ تحریک ایک عرصہ کیلئے خاموش ہوگئی۔

گذشتہ جنگ عظیم اور صیہونی تحریک

۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہوئی۔ اس نے صیہونی تحریک کیلئے ایک نیا باب وا کردیا۔ فلسطین کی جغرافیائی پوزیشن بحر روم اور نہر سوئز سے قربت۔ اور عراق کے تیل کے ذخیرے، ان تمام چیزوں نے فلسطین کو برطانیہ کے لئے بہت زیادہ اہم بنا دیا تھا۔ برطانیہ کی انتہائی تمنا تھی کہ فلسطین پر قبضہ کرکے اس پر اپنا اقتدار جمائے۔ لیکن فلسطین کے عربوں کو ابھار کر ترکی کے خلاف جنگ پر آمادہ کرنا بھی مقصود تھا۔ اسلئے فلسطین کے عربوں سے آزادی کا وعدہ کرکے انھیں ترکوں کے خلاف لا کھڑا کیا۔ ادھر امریکہ کے سرمایہ دار یہودیوں کو بھی مالی امداد کے لئے آمادہ کرنا ضروری تھا۔ اسلئے یہودیوں سے بھی فلسطین میں ایک نیشنل اسٹیٹ کے قیام کا وعدہ کیا گیا اس سے امریکہ کے سرمایہ دار یہودیوں پر بہت اچھا اثر پڑا اور انھوں نے اتحادی کاز میں کئی سو کروڑ ڈالر دیئے۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ عظیم میں برطانیہ کی کامیابی یہودیوں کی مالی امداد کی ایک بڑی حد تک مرہون منت ہے۔

اعلان بلیفور کا افسانوی پہلو

اس اعلان کے متعلق ایک نہایت عجیب و غریب روایت مشہور ہے ۱۹۱۶ء میں جنگ عظیم پوری ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کے ساتھ جاری تھی اور برطانیہ کے لئے نہایت نازک صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ اسی دوران میں اسی ٹون (Acetone) (ایک قسم کا تیزاب) جو پھٹنے والے بموں کی اجزا ترکیبی کا ایک اہم جزو تھا اس کی پیداوار بہت

کم ہوگئی۔اس کی کمی برطانیہ کے لئے نہایت پریشان کن ثابت ہورہی تھی۔اسوقت مانچسٹر یونیورسٹی میں ڈاکٹر ویزمین (Weizmann) ایک مشہور ماہر کیمیا پروفیسر تھے۔ڈیوڈ لائڈ جارج نے جو اسوقت وزیر اعظم تھے ڈاکٹر ویزمین کو بلایا اور صورت حال کی نزاکت سے آگاہ کیا۔ڈاکٹر موصوف نے محکمہ بحریہ کے دارالتجربہ میں بیٹھکر بڑی کاوشوں کے بعد اسی ٹون کا مصنوعی قائم مقام ایجاد کرلیا۔اسی ٹون کا قائم مقام پھل اور اشیائے خوردنی وغیرہ کے رس سے تیار ہوا تھا۔لائڈ جارج کو جب اس عظیم الشان کامیابی کی اطلاع ملی تو وہ اچھل پڑا کیونکہ اب برطانیہ کو پھٹنے والے بموں کی کمی کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔لائڈ جارج نے ڈاکٹر ویزمین کو بلایا اور کہا "ڈاکٹر ویزمین تم نے اس آڑے وقت میں حکومت برطانیہ کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔اس کے صلہ میں میں ملک معظم سے سفارش کرونگا کہ تم کو حکومت کی طرف سے کوئی بڑا اعزاز عطا کیا جائے۔لیکن ڈاکٹر موصوف نے اعزاز اور مالی انعام دونوں کے قبول کرنے سے انکار کردیا۔اس نے لائڈ جارج سے کہا "میں ملک معظم سے صرف ایک چیز مانگتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ فلسطین میں میری قوم کے لئے ایک قومی اسٹیٹ قائم کردی جائے۔"

۱۹۱۷ء میں لارڈ النبائی (Lord Allenby) نے ترکوں کو شکست دیکر اس پر قبضہ کرلیا اور ملک معظم کی حکومت نے بیلفور کا تاریخی اعلان شائع کردیا۔اس اعلان میں یہودیوں کے لئے فلسطین میں ایک قومی اسٹیٹ کے مطالبہ کو تسلیم کرلیا گیا۔صیہونی تحریک کی یہ شاندار کامیابی تھی۔

اس کے بعد یہودی فلسطین میں آنا شروع ہوگئے۔سنہ ۱۹۲۲ء میں ۸۳۷۹۰ یہودی فلسطین میں پہنچ چکے تھے۔سنہ ۱۹۳۶ء میں انکی تعداد ۶۸۳۰۷۳ تک پہنچ گئی۔عربوں نے حکومت برطانیہ کو دوران جنگ کے وعدے یاد دلائے لیکن کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملا۔بالآخر فلسطین کے عربوں نے

مفتیٔ اعظم فلسطین کی سرکردگی میں ایجی ٹیشن شروع کردیا۔ برطانیہ نے جب اس تحریک کو فوجی طاقت سے دبانا چاہا تو عربوں نے بھی تشدد شروع کردیا اور ایک سخت خونریز خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ بلحاظ ۱۹۳۶ء کے اپریل میں برطانیہ نے ۲۰ ہزار فوج فلسطین بھیجدی۔ لیکن خانہ جنگی جاری رہی بلحاظ ۱۹۳۷ء میں حکومت برطانیہ نے پیل رپورٹ شائع کی جس کے مطابق فلسطین کو عربی، یہودی اور برطانوی علاقوں میں تقسیم کردیا گیا تھا لیکن عربوں نے اس کو ماننے سے انکار کردیا۔ اس دوران میں ہولناک خانہ جنگی ہوتی رہی۔ ہزاروں عرب اور یہودی تباہ وبرباد ہوگئے۔ بعض اوقات ان کی لاشوں سے فلسطین کی سڑکیں پٹ جاتی تھیں۔ بالآخر ۱۹۳۹ء کے آغاز میں ایک گول میز کانفرنس بلائی گئی اور اس کے ختم ہونے پر قرطاس ابیض (White paper.) شائع ہوا۔ لیکن عربوں کے مفاد اس میں بھی محفوظ نہیں تھے۔ یہ بدامنی اور خونریزی جاری تھی کہ دنیا کی دوسری ہولناک جنگ شروع ہوگئی اور فلسطین کا معاملہ معرض التوا میں پڑگیا۔ امید ہے کہ اس جنگ کے بعد برطانوی تدبر اپنے ناخن تدبیر سے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کریگا اور اسکا اطمینان بخش حل تلاش کرلیگا۔